© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن کے اسالیبِ دعوت و استدلال

علم و معرفت کے متعدد اسلوب ہیں اور تاثر پذیرائی کے مختلف انداز۔ بقول بیکن کے "علم و ادراک پانی کی طرح ہے جو کبھی اوپر کی طرف سے ابر و سحاب کی شکل میں دلوں کی زمین کو سینچتا ہے اور کبھی نیچے، اس کی سوتیں رِستی بہتی اور اُمڈتی رہتی ہیں۔ کبھی فطرت کی روشنی اور سحر کاری سے نظریں خیرہ ہوتی ہیں اور کبھی الہام و وحی سے فکر و نظر کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔" پھر ان تاجدارانِ وحی میں سے بھی ہر ایک کی اپنی خصوصیات ہیں۔ حضرت سلیمان محبتِ الٰہی کو تغزل کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت داؤد نغمہ و مزامیر کی دُھنوں میں زبور کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی تعلیمات میں نظم و نسق، اور معاشرہ کے متعلق مسائل و احکام کا ذکر ملتا ہے۔ اور حضرت مسیح تمثیلات کے بادشاہ ہیں۔ یہ قاعدہ و قانون کی سخت گیریوں کی ایسے سیدھے سادے اور پیارے انداز میں نشاندہی کرتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والا فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔

دراصل دلوں میں روشنی ایک ہی راہ سے نہیں آتی۔ اور نہ یقین و آگاہی کی مئے کسی ایک ہی خم و ساغر کی رہینِ منت ہے۔ سچائی کے کئی رنگ ہیں اور اظہار و ابلاغ کے گوناگوں طریقے۔ پچھلی صدی میں ارسطو کے اس نظریے کی منطق کے حلقوں میں خوب خوب تردید ہو چکی ہے کہ حق کی جستجو صغریٰ و کبریٰ کے لگے بندھے اصولوں کی پابند ہے۔ یا جب تک استدلال اور پیرایۂ بیان کو اشکالِ اربعہ میں سے کسی ایک شکل کے سانچے میں نہ ڈھالا جائے اس وقت تک کوئی نتیجہ ہی برآمد نہیں ہوتا۔ ارسطو کا یہ نظریہ انسانی فطرت کے سرسری مطالعہ پر مبنی ہے۔ انسان کے دل و دماغ کی ساخت اتنی پیچیدہ ہے کہ کوئی بھی اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ کبھی ٹھوس دلائل اس پر اثر نہیں کرتے اور کبھی شاعرانہ نکتہ طرازی غور و فکر پر مجبور کر دیتی ہے۔ کبھی سامنے کے حقائق دلوں پر پردے ڈال دینے کا موجب ہوتے ہیں۔ اور کبھی دُور از کار باتیں انسان کو موہ لیتی ہیں۔ اور یہ منظر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ پتھروں سے تو پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں لیکن پھول سے نازک دل سنگ و آہن کا روپ دھار لیتے ہیں یعنی انسان فطرت کا وہ اعجوبہ ہے کہ جس کے بارہ میں یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ حسن و جمال کی کون ادا اس کو فریفتہ کر سکے گی اور غمزہ و عشوہ کے کن تیوروں سے یہ صیدِ فتراک بن سکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن حکیم جو صحفِ سماوی کی آخری کڑی اور ترجمانِ حقیقت ہے اس راز سے اچھی طرح شناسا ہے کہ حق و صداقت کو دلوں میں کیونکر اتارا جاسکتا ہے اور کن کن راہوں اور طریقوں سے دین کے معارف کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ قرآن حکیم سے شغف رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں ابلاغ و اظہار کے کن کن وسائل سے تعرّض کیا گیا ہے۔ کہیں صرف خبر سے کام لیا گیا ہے اور کہیں صرف انشا سے۔ کہیں وعدہ ہے، کہیں وعید۔ کہیں منطقی طریق استدلال اور کہیں اظہار واقعہ۔ کہیں تردید ہے، کہیں اثبات۔ کہیں ٹھیٹھ حقیقت کی جلوہ گری ہے، کہیں رمز و استعارہ کی پیچ پیچ جادو گری ہے کہیں سوال کی چبھن ہے اور کہیں جواب کی تسکین۔ کہیں اقوام و ملل کی تاریخ عروج و زوال کو بطورِ استدلال کے پیش کیا ہے اور کہیں اُن انعاماتِ الٰہی کی نشاندہی پر غور و فکر کو مرکوز کردینے پہ اکتفا کیا ہے، جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن حکیم نے سمجھانے بجھانے کے وہ تمام پہلو استعمال کیے ہیں جن سے انسانی فطرت متاثر ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے اس میں حضرت داؤد کے مزامیر کی کھنک بھی ہے اور حضرت سلیمان کے اسلوبِ تغزل کی جھلک بھی۔ اس میں حضرت موسیٰ کا جلال بھی ہے، اور حضرت مسیح کا جمال بھی۔ شریعت و قانون کی حد بندیاں بھی ہیں اور معنویت و ادراک کی روح بھی۔

یہ دعویٰ ہمارا نہیں خود قرآن حکیم کا ہے کہ اس کتاب حکمت میں دعوت و ابلاغ کے ہر ہر ڈھنگ کو اختیار کیا گیا ہے:-

ولا یأتونك بمثلٍ الّا جئنٰك بالحق واحسن تفسیرًا ہ (فرقان : ۳۳)	اور یہ لوگ کیسا ہی انداز پیش کریں، ہم ان کا ٹھیک اور اس سے بڑھ کر جواب پیش کرتے ہیں۔
ولقد صرفنا للناس فی ھٰذا القراٰن من کل مثل۔ (بنی اسرائیل : ۸۹)	اور ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کا اسلوب اختیار کیا۔
ولقد صرفنا فی ھٰذا القراٰن لیذکروا (بنی اسرائیل : ۴۱)	اور ہم نے اس قرآن میں بوقلموں طریق اس لیے اختیار کیے ہیں تاکہ یہ سمجھ لیں۔

اسالیبِ استدلال کے تنوّع کو جاننے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اصول پنجگانہ کو اس بحث کو چھیڑنے بنا کہ یہ کس حد تک جامع و مانع ہیں اساس اور بنیاد قرار دیا جائے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن نے جن مضامین سے تعرض کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مخاصمہ یا ردّ و مناظرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲ - احکام

۳ - التذکیر بآلاء اللہ

۴ - التذکیر بایام اللہ

۵ - التذکیر بالموت و بعد الموت

مخاصمہ یا ردّ و مناظرہ سے یہ مقصود نہیں ہے کہ قرآن حکیم نے اصطلاحی معنوں میں مجادلہ کی طرح ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں باقاعدہ خصم کو تسلیم کر کے بعض معارضہ کے اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ اس کے برعکس اس سے مراد اس قدرتی اور ناگزیر مرحلہ کی تشریح ہے جس سے ہر اُس شخص کو گزرنا پڑتا ہے جو عوام کی اصلاح کرنا چاہتا ہے جو قلب و ذہن کی سطح کو بلند کرنے کا خواہاں ہے جو معاشرہ کی فکری و عملی گمراہیوں کی نشاندہی پر مامور ہے، اور جو اس بات کا متمنی ہے کہ لوگ زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں۔ ظاہر ہے کہ جو رہنما بھی ان عزائم کو لے کر میدان میں اُترے گا اس کو مخالفت کے ایک طوفان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور انبیاء علیہم السلام کا تعلق چونکہ اس گروہ سے ہے اس لیے اس کو بھی رُشد و ہدایت کے اس موڑ سے گزرنا پڑتا ہے لیکن ان کے نزدیک یہ لوگ جو دعوت و ارشاد کے مخاطب ہیں، ان معنوں میں ہرگز خصم یا مخالف نہیں ہو سکتے کہ اُن کو شکست دینا یا ان پر غلبہ و تفوق حاصل کرنا رشد و ہدایت کا جزو ہو، یا یہ ان کو دل کے مریض تصوّر کرتے ہیں اور یہ سمجھ کر ان سے بات چیت کرتے ہیں کہ ان کی روح بیمار ہے، ان کی نفسیات میں خلل ہے اور یہ کسی عظیم غلط فہمی کا شکار ہیں، لہٰذا قلب و ذہن کی یہ کیفیت شفقت و محبت چاہتی ہے۔ گہرے نفسیاتی تجزیہ کی خواہاں ہے اور ابلاغ کے ایسے وسائل کی متقاضی ہے کہ جن سے ان کو روحانی غذا ملے، تسکین حاصل ہو اور حق ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔

قرآن حکیم صاف صاف ان کے انکار و تمرّد کو مرض سے تعبیر کرتا ہے:

فی قلوبہم مرض فزادھم اللہ مرضاً (البقرہ : ۱۰)	ان کے دلوں میں روگ ہے جس کو اللہ نے بڑھا دیا ہے۔
اذ یقول المنفقون والذین فی قلوبہم مرض۔ (انفال : ۴۹)	وہ وقت یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے یوں کہتے تھے۔
لئن لم ینتہ المنفقون والذین	اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فی قلوبھم مرض ط (احزاب : ۶۰) ہے باز نہ آئے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اگرچہ مخالف ہیں اور توحید و آخرت کی دعوت کے دشمن ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام جب ان کا سامنا کریں اور ان کو تعلق باللہ کی دعوت دیں اور سفرِ آخرت کے لیے تیار کریں تو اس اصول کا خیال رکھیں کہ اصل مقصد ان پر غلبہ حاصل کرنا نہیں، ان میں احساسِ شکست پیدا کرنا نہیں، اور نقض و معارضہ سے ان کا منہ بند کرنا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس نہج اور اسلوب سے اُن کو مخاطب کیا جائے کہ جس سے دل کے دریچے حق کی پذیرائی کے لیے کھل جائیں اور سچائی کی تپش و ضو سے زندگی از سرِ نو ان کی رگ و پے میں دوڑ جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ نہج یا اسلوب کیا ہے؟ قرآن ہی کی زبان میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ادع الی سبیل ربّك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔ | اپنے رب کی طرف لوگوں کو بلاؤ دانش سے موعظہ حسنہ سے اور ان سے بحث کرو تو بطریقِ احسن۔

اس آیت میں دعوت و مخاصمہ کا کوئی منطقی طریق متعین کرنے کے بجائے، اُن نہایت ہی قیمتی اصولوں کی تشریح کی گئی ہے کہ جن سے دلیل کا مزاج متعین ہوتا ہے، اور استدلال اس لائق ہوتا ہے کہ شک و ریب کی بیماریوں کو دُور کر دے اور آفتابِ حقیقت کو یوں چمکا دے کہ جس سے دل و دماغ کے تمام گوشے دمک اٹھیں۔ ان اصولوں کو ہم چار خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

اوّل سب سے اہم نکتہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ پیغام و دعوت کی غرض و غایت یہ ہو کہ مخاطب کو پروردگارِ عالم کی راہ سے شناسائی حاصل ہو۔ یہ دعوت نہ اظہارِ علم کے لیے ہو نہ اظہارِ شخصیت کے لیے۔ اس میں تنگ نظرانہ تعصّبات کی بھی گنجائش نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ سننے والے کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اس کے سامنے طلب و جستجو کی ایسی منزل ہے جو ہمہ گیر ہے، آفاقی ہے اور تمام انسانیت کے لیے ہے۔ سبیل رب کی طرف بلانے کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس میں محبت اور پیار، تغذیہ اور تربیت، تسہیل اور تدریج کے انہی پیمانوں کو ملحوظ رکھا جائے، جن پر لفظ ربوبیت دلالت کناں ہے۔

دوئم۔ مخاطب کو سمجھانے کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کیا جائے۔ اس میں نہ تو عام واعظانہ پھکڑپن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مناظرانہ سطحیت ہو اور نہ طعن و تشنیع اور الزام و اعتراض کی بوچھاڑ ہو، بلکہ ایسا اسلوب اور انداز ہو جو بدرجۂ غایت شائستہ ہو، اور قبولیت و پذیرائی کی اس منطق کے عین مطابق ہو، جو فکر و تدبر اور احتیاط و سلیقہ چاہتی ہے۔ کیونکہ یہی وہ منطق ہے جو خیالات و افکار کی سمتوں کو بدل سکتی ہے اور تعصب و عناد کے فولاد و آہن کو پگھلا دینے پر قادر ہے۔ یہ منطق خصوصیت سے دو باتیں چاہتی ہے۔ اول یہ کہ مخاطب کی ذہنی سطح کا پورا پورا اندازہ ہو اور فکر و استدلال، یا خطابت و وعظ کے مرحلہ میں اس چیز کا خاص خیال رکھا جائے کہ سننے والا عقل و نفسیات کے کس درجہ پر فائز ہے۔ دوسرے یہ کہ دعوت و ابلاغ کے لیے موقع و محل، اور وقت و زبان کی موزونیت کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ جس طرح ہر بیج پنپنے اور پروان چڑھنے کے لیے وقت کا منت پذیر ہوتا ہے، اسی طرح، عقائد، اور فکر و خیال بھی دلوں میں گھر کرنے اور پھلنے پھولنے کے لیے مخصوص اوقات چاہتے ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بہت سے قیمتی تصورات، محض اس لیے بے اثر ہو کے رہ گئے ہیں کہ پیش کرنے والے نے ان کے لیے موزوں اور بر محل مواقع کا خیال نہیں رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں آنحضرت کے اس طرزِ عمل سے خاص طور پر رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ آپ جب تک کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا، انفرادی اور اجتماعی سطح پر ضرورت پیش نہ آتی اور تعلیم و تربیت کی موزونیتیں مجبور نہ کر دیتیں، اس وقت تک مجلسِ وعظ و تذکیر منعقد نہ کرتے۔

سوئم۔ موعظہ حسنہ کا تعلق الفاظ و پیرایۂ بیان کی خوبیوں سے ہے۔ غرض یہ ہے کہ جہاں کسی عقیدہ کی استواری، بجائے خود کامیابی کی ضامن ہے۔ وہاں الفاظ اور پیرایہ بیان کا انتخاب بھی کم اہم نہیں۔ فکر صحیح، اور دلیل کا وزن مسلم لیکن دلیل کا تانا بانا صرف۔ مجرد معنی سے نہیں ترتیب پاتا اور صرف صغریٰ اور کبریٰ کو ترتیب دینے سے تیار نہیں ہو پاتا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ موزوں الفاظ اور مناسب انداز کا اظہار کر لیا جائے۔ مگر موزوں الفاظ یا مناسب پیرایۂ بیان سے مراد یہ نہیں کہ لفظی صنائع بدائع سے کام لیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں اور جس مفہوم و مطلب کو آپ دلوں میں اتارنا چاہتے ہیں، اس کے لیے ایسے الفاظ یا لفظ کا انتخاب کیجیے جو اس درجہ مناسب ہو کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ پڑے۔

چہارم۔ دعوت و ابلاغ میں ایک منزل ایسی آجاتی ہے جہاں مجادلہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں ایک سامع، بعض دلائل کے پیشِ نظر اپنے دعوے پر اَڑجاتا ہے۔ اس صورت میں قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ داعی الی اللہ مجادلہ کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرے جو احسن ہو۔ احسن کے یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ کی طرف بلانے والا، دلیل کے بجائے مدلول پر نظر رکھے اور ایسا مؤثر طریق اختیار کرے جس سے سامع کے شکوک و شبہات پر براہِ راست زد پڑتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اگر ایک معقول دلیل سامع کی سمجھ سے بالا معلوم ہو تو اس پر اصرار نہ کرے۔ بلکہ یہ دیکھے کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اور کون طریق زیادہ قرینِ عقل و حکمت ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم اور نمرود کے طریقِ مجادلہ میں ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے جب بابل و نینوا کے حاکم نمرود کے آگے جھکنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ سجدہ و عبادت کا سزاوار صرف پروردگارِ عالم ہے تو اُس نے کج بحثی کی بنا پر پوچھا۔ کون پروردگار؟ حضرت ابراہیم کا جواب یہ تھا:۔

ربی الذی یحی و یمیت۔ میرا پروردگار وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت ہے۔ (بقرہ : ۵۸)

بات بہت معقول تھی۔ حضرت ابراہیم کی دلیل کا منشا یہ تھا کہ اس عالمِ مادی میں جو سمت و منزل کا تعیّن ہے اور اس میں اتفاق کی جو یہ نوعیت کار فرما ہے کہ بے جان مادّہ، زندگی کی طرفہ طرازیوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یا بے جان خلیئے کثیر الانواع نباتی خلیوں میں بدل رہے ہیں۔ اور نباتی خلیئے، زندہ متحرک اور باشعور خلیوں کا رُوپ دھار رہے ہیں، تو یہ نظم و نسق، یہ ترتیبِ ظہور اور منظم حرکت و تغیر کس اصول کے ماتحت ہے۔ اگر اس عالم میں کوئی علیم و حکیم اور شفیق و مہربان ہستی موجود ہے کہ جس نے تخلیق و آفرینش کے اس نظام کو تھام رکھا ہے، تو ظاہر ہے وہی پروردگار ہو سکتا ہے جس کے آگے ہم سب کو جھکنا چاہیے۔ اصولی طور پر چاہیے یہ تھا کہ اس چشم کشا دلیل سے نمرود متاثر ہوتا، اور اپنی خدائی کے زعمِ باطل سے دست بردار ہو جاتا لیکن بُرا ہو نشۂ اقتدار اور ہوسِ حکمرانی کا۔ اس نے کج بحثی کی آڑ لی کہ واہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں مطلق العنان حاکم کی حیثیت سے ان لوگوں کی جان بخشی پر قادر ہوں کہ جو از رُوئے قانون سزائے موت کے مستحق ہیں۔ اور بے گناہوں کو اسی اختیار کے بل موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں جو زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند ہیں۔

ظاہر ہے اس طرزِ فکر کے مقابلہ میں دو ہی موقف اختیار کیے جا سکتے تھے۔ یا تو نمرود کو جاہل ثابت کیا جاتا اور پیش کردہ دلیل کی منطقی استواری پر بہرحال زور دیا جاتا اور یا پھر سرے سے اس دلیل ہی کو چھوڑ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا جاتا اور اس سے زیادہ صاف، واضح اور موثر استدلال سے کام لیا جاتا۔ پہلی صورت میں یہ صرف مجادلہ ہوتا جس سے کہ نمرود کے جذبۂ عناد کے بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ اور دوسری صورت میں مجادلہ لیکن بطریقِ احسن۔ جس سے کہ دلوں کا زنگ چھٹ جاتا ہے اور حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دوسری صورت اختیار کی۔ آپ نے فرمایا:

فان اللہ یأتی بالشمس من المشرق فأت بھا من المغرب۔ (بقرہ: ۲۵۸)

خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔

غور فرمائیے دلیل کا انداز وہی ہے۔ یعنی دنیا کے نظم و ترتیب سے اس نتیجہ پر پہنچنا کہ اس کے پیچھے حکمت و عقل، اور پرورش و ربوبیت کی فراوانیاں کارفرما ہیں۔ لیکن پہلی دلیل سے یہ مقصد حاصل نہ ہوا اور دوسری دلیل نے نمرود کو اس درجہ حیران و ششدر کر دیا کہ کوئی جواب بن نہ آیا۔ قرآن حکیم نے اس کی نفسی کیفیت کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا:-

فبھت الذی کفر (بقرہ: ۲۵۸) پس کافر ششدر ہو کر رہ گیا۔

کہ اس دلیل سے، نمرود جو کفر و انکار کی روش اختیار کیے ہوئے تھا، مبہوت ہو کر رہ گیا۔

مجادلہ بطریقِ احسن کی ایک مثال تو یہ ہوئی کہ اگر ایک دلیل موثر نہیں ہوتی ہے تو اس پر اصرار نہ کیا جائے، اس سلسلہ کا دوسرا اہم رُخ یہ ہے کہ اگر سائل کا سوال بجائے خود غیر مفید ہے یا غامض ہے اور سائل کی ذہنی سطح سے اونچا ہے، تو اسے نہایت عمدگی سے سوال کے ان پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی جائے جو مفید ہیں اور آسانی سے اُن کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن میں ان دو مقامات پر غور کیجیے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

یسئلونک عن الاھلۃ. قل ھی مواقیت للناس والحج

(چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے بارہ میں) سوال کرتے ہیں۔ تم کہدو، حج کے لیے اور لوگوں کے لیے وقت کا پیمانہ ہیں۔

یعنی لوگ پوچھنا یہ چاہ رہے ہیں کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے میں کیا حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں: ہلال سے بڑھ کر یہ بدرِ منیر کس طرح بن جاتا ہے، وہ کون قانون ہے جو اس کو گھٹاتا اور بڑھا دیتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے سوال کا مزاج طبیعیاتی نوعیت کا ہے۔ قرآن ظاہر ہے کہ طبیعیات کی کتاب نہیں۔ اس کے دائرۂ تبلیغ میں یہ داخل نہیں کہ کائنات میں جو تغیر و تبدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رونما ہوتا ہے اس کے لیے اسباب و علل کی نقاب کشائی کرے۔ یہ تو کتابِ ہدایت ہے، ایک دینی صحیفہ ہے۔ جس کی غرض و غایت رشد و ہدایت کی راہوں کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے سوال کے مزاج کی پروا کیے بغیر قرآن حکیم، پوچھنے والوں سے کہتا ہے کہ تمھیں یہ نہیں دریافت کرنا چاہیے کہ چاند میں تغیر و تبدل کے طبعی اسباب کیا ہیں۔ بلکہ یہ دریافت کرنا چاہیے کہ چاند کے ان تغیرات سے ہم دینی شعائر و احکام کے سلسلہ میں کیا روشنی حاصل کرسکتے ہیں۔ اور اگر سوال کی یہ نوعیت ہو اور تم ان تغیرات کے دینی فوائد کے بارہ میں پوچھنا چاہتے ہو تو یہ سن لو کہ ان سے ہم یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اشہر حرم کون سے ہیں۔ کن کن مہینوں میں ہمیں حج کے لیے تیار رہنا چاہیے، رمضان کب آتا ہے، عید کب منائی جائے گی۔ اور یہ کہ کون مہینہ کب شروع ہوتا اور کب اختتام پذیر ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر ہر کتاب سے انھی نوقعات کو وابستہ کرنا چاہیے کہ جو اس کے موضوع سے متعلق ہیں۔ یا جن کے دریافت کرنے سے کسی دینی مسئلہ کی وضاحت ہوتی ہو۔ طبعیات کی باریکیوں سے بحث کرنا اس کے موضوع سے یکسر خارج ہے۔ دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

ویسئلونک عن الروح قل الروح
من امر ربی ط وما اوتیتم من العلم
الا قلیلا۔ (۸۵)

یہ سوال یہودیوں نے پوچھا۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ یہودی مزاج سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی مذہبی روایات میں جس قدر سختی اور تنگ نظری پائی جاتی ہے وہ فکر و فہم کے لطائف کے لیے اتنی گنجائش ہی کب چھوڑتی ہے کہ کوئی شخص اونچے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو غور و تعمق کا ہدف قرار دے سکے۔ لیکن یہی یہودی جو اپنے دائرہ دینی میں کٹر الفاظ پرست اور سطحیت پسند ہیں محض آنحضرتؐ کا امتحان لینے کے لیے، اس طرح کے باریک اور مابعدالطبیعیاتی سوالات پوچھتے ہیں، تاکہ اگر جواب ان کے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو تو اپنے حلقوں میں یہ کہہ سکیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے جو ان حکیمانہ سوالات کا جواب بھی ڈھنگ سے نہیں دے سکتا۔

قرآن کی حکمتِ بالغہ ملاحظہ ہو۔ وہ اس کا جواب دیتا ہے، جو اگرچہ ان کی نیت اور منشا کے عین مطابق نہیں تاہم ان کے مسلّمات کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ناممکن تھا کہ وہ اس پر طعنہ زن ہوسکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہودیوں کی اس عالم مادی کے بارہ میں یہ رائے تھی یہ دراصل کلمہ کن، یا کلمہ تکوین کی براہ راست کرشمہ سازی ہے۔ قرآن نے انہی کی اصطلاحوں میں انھیں جواب دیا ہے کہ یہ زندگی اور روح بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیّت کا ایک پہلو یا امر ہے۔ ظاہر ہے جواب میں ان کے ہاں ان کے منشا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال سے اُن کی غرض یہ تھی کہ جسم و روح کی نوعیت پر روشنی ڈالی جائے اور دونوں کے حدود کا الگ الگ تعین کیا جائے۔ قرآن نے جو جواب دیا، ظاہر ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، اور اُن کے مسلّمات کی رُو سے بھی درست ہے۔ لیکن اس سے اُن کا منشا پورا نہیں ہوتا۔ کیوں پورا نہیں ہوتا؟ قرآن کہتا ہے، اس لیے کہ جسم و روح میں رشتہ و ناطہ کے تعین کا سوال ایسا ہے جس کو ان علمی وسائل و ذرائع کے بل پر نہیں سمجھا جا سکتا، جو اس وقت تمھیں حاصل ہیں۔ تمھارا علم اس بارہ میں بہت کم ہے اور لطف یہ ہے کہ آج بھی جب کہ انسان نے علوم و فنون میں قیامت کی ترقی کر لی ہے، یہ سوال تشنہ ہے کہ روح اور جسم، یا مادّہ حیات، اور حیات و شعور میں تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ جسم و مادّہ کی سرحدیں کہاں ختم ہوتی ہیں، اور زندگی و شعور کی نشاط آفرینیوں کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے؟ اس آیت سے مجادلہ بطریق احسن کا یہ پہلو بہرحال نکھر کر سامنے آ جاتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر سوال کا جواب سائل کے منشا کے مطابق ہی دیا جائے۔ ضروری یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سائل کو وہ آسان اور عام فہم بات بتا دی جائے جو اس کے مسلّمات کے موافق ہو۔ اور اس کے ساتھ متعلقہ مسئلہ میں جو غموض پنہاں ہے اس کی نشاندہی بھی کر دی جائے اور صاف صاف بتا دیا جائے کہ سر دست اس مسئلہ کا ادراک تمھارے فہم سے بالا ہے۔ اس مرحلہ پر اس نکتہ کی وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ قرآن حکیم جب ادراک روح کے مسئلہ میں انسان کی کم علمی یا بے مائیگی کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کا نقطہ نظر انسانی علم و ادراک کے بارہ میں تشاؤم پر مبنی ہرگز نہیں۔ قرآن حکیم یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا کہ انسان علوم و فنون میں اور معرفت میں ان حالات و ظروف سے آگے نہیں بڑھ پائے گا کہ جن کی وجہ سے وہ زندانی جہل بنا ہوا ہے اور ہمیشہ روح کے غوامض اور دقائق سے ناآشنا ہی رہے گا۔ ہو سکتا ہے یہ حالات و ظروف بدل جائیں اور انسان علوم و فنون اور ریاضت و مجاہدہ سے اس مقام پر فائز ہو جائے کہ جہاں جسم و مادّہ کی تاریکیاں حائل نہیں ہوتیں۔ جہاں انسان کی محدود "انا"، جسم کی کینچلی اتار پھینکے اور روح کی تابانیوں کا براہ راست مشاہدہ کر سکے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com